وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو تو اس گناہ کا بوجھ اس کے
باپ پر ہوگا۔

اس سفارش کے قانون کی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہر وہ شخص جو کسی لڑکے یا لڑکی کا باپ ہے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اگر وہ اس قانون کے بننے پر راضی ہے تو اس کے نتیجے میں اس کی اولاد جن فتنوں میں مبتلا ہوگی اس کے گناہوں سے جس طرح ان سفارشات کے مرتب کرنے والوں اور ان کو قانونی شکل دینے والوں کے اعمالنامے سیاہ ہونگے اسی طرح ان باپوں کے اعمالنامے بھی سیاہ ہونگے جو ان سفارشات پر راضی یا خاموش رہیں گے۔

۷۔ اس طرح کا قانون نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام جلیل القدر صحابہ کے خلاف ہماری طرف سے بے اعتمادی بلکہ ملامت کا ایک اعلان ہے۔ کیونکہ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نکاح کیا اور اس وقت ان کی عمر سولہ سال سے کم تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی حضرت ام کلثوم سے نکاح کیا اور ان کی عمر بھی ہرگز سولہ سال کو نہیں پہنچی تھی جب ہماری آئندہ نسلیں ایک طرف یہ قانون پڑھیں گی اور دوسری طرف اسلام کی یہ تاریخ پڑھیں گی تو کیا ان کے ذہنوں میں یہ خیال نہیں پیدا ہوگا کہ ہمارے بہترین اسلاف، یہاں تک کہ ہمارے پیغمبر بھی العیاذ باللہ آج اس ملک میں ہوتے تو ہمارے قانون کے رُو سے مجرم ہوتے؟

عورت کے لیے مساوی حق طلاق کمیشن کی سفارش یہ ہے کہ یہ بات از روئے قانون جائز کر دی جائے کہ اگر عورت کو مرد کی طرف سے معاہدۂ نکاح میں حق طلاق تفویض کر دیا گیا ہو تو وہ بھی مرد کی طرح طلاق دے سکتی ہے۔

اس بات کو جائز ثابت کرنے کے لیے پہلے کمیشن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ معاہدۂ نکاح میں ایسی شرطیں شامل کی جا سکتی ہیں یا نہیں جو اسلام اور اخلاق کے منافی نہ ہوں اور ان شرطوں کو عدالتوں کے ذریعہ سے نافذ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ پھر اسی کے ساتھ ایک دوسرا سوال یہ جوڑ دیا گیا ہے کہ یہ بات جائز ہے

یا نہیں کہ از روئے قانون یہ صحیح تسلیم کیا جائے کہ معاہدۂ نکاح میں یہ شرط درج ہو سکتی ہے کہ عورت کو بھی اعلان طلاق کا وہی حق حاصل ہوگا جو مرد کو حاصل ہے؛

کمیشن کے نزدیک ان دونوں سوالوں کا جواب قطعی اثبات میں ہے اس وجہ سے اس کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کے تجویز کردہ معیاری نکاح نامہ میں یہ شرط شامل کر دی جائے کہ عورت کو بھی طلاق دینے کا اسی طرح حق حاصل ہوگا جس طرح شوہر کو حاصل ہوگا۔ معاہدۂ نکاح میں اس شرط کے درج ہو جانے کے بعد عدالت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ شوہر کو اس شرط کے ایفاء پر مجبور کرے۔

اس کے جواز کی تائید میں کمیشن نے شرح وقایہ سے فقہ کا ایک جزئیہ بھی ڈھونڈھ نکالا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے یہ کہہ بیٹھے کہ "تو جب چاہیو اپنے اوپر طلاق وارد کر لیجیو" تو عورت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں جب چاہے اپنے اوپر طلاق وارد کر سکتی ہے۔

نکاح کی شرائط کے متعلق چند باتیں اصولی طور پر پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جو چیزیں رشتۂ ازدواج کے فطری اور اخلاقی تقاضوں میں از خود شامل ہیں ان کے سوا دوسری نئی نئی شرطیں ایجاد کرنا اور ان کو شرائط نکاح کی حیثیت سے میاں بیوی کا ایک دوسرے پر عائد کرنا اور ان کو ایک معاہدۂ نکاح میں درج کر کے عدالتوں کے ذریعہ سے نافذ کرانے کی کوشش کرنا منشائے اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ مرد بیوی کے حقوق زوجیت ادا کرے، اس کے نان نفقہ کا بار اٹھائے، جو پہنے وہ پہنائے، جو کھائے وہ کھلائے، اس کے آرام و راحت کا خیال رکھے، اگر اس کے کوئی اور بیوی بھی ہو تو دونوں کے درمیان عدل کرے، یہ سب نکاح کے فطری تقاضے ہیں اور ان کا پورا کرنا اس معاہدہ کے رُو سے ضروری ہے جو بندہ خدا سے کر چکا ہے، خواہ یہ باتیں کسی "معیاری نکاح نامہ" میں درج ہوں یا نہ ہوں۔ اسی طرح بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوہر کے جذبات اور اس کی خواہشوں کو ملحوظ رکھے، اس کے گھر اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال اپنے فرائض میں سمجھے، اس کے بستر کو کسی غیر سے پامال نہ کرائے، اس کے رنج و راحت کی شریک بنے، اس کے رازوں کی حفاظت کرے۔ ان ساری باتوں کی پابندی اس معاہدہ کی رو سے عورت پر واجب ہے جو اپنے آپ کو کسی مرد کے حبالۂ عقد میں دیکر اس نے اپنے رب سے کیا ہے، خواہ

یہ باتیں کسی معاہدۂ نکاح میں درج ہوں یا نہ ہوں۔ ان فطری شرائط کے سوا دوسری نئی نئی شرطیں ایجاد کرنا اور میاں بیوی کا ایک دوسرے کو ان شرطوں سے باندھنے کی کوشش کرنا، جیسا کہ عرض کیا گیا، اسلام کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ اس سے باہمی اعتماد و محبت کے بجائے شروع ہی سے میاں اور بیوی کے درمیان بدگمانی و بے اعتمادی کی ایک بنیاد پڑ جاتی ہے اور جب بنیاد ہی غلط پڑ جائے تو آگے چل کر عمارت کا ٹھیک بننا کس طرح ممکن ہے؟ بخاری شریف میں یہ جو حدیث ہے کہ احق الشروط ان توفوا بہ ما استحللتم بہ الفروج (سب سے زیادہ پوری کیے جانے کے لائق وہ شرطیں ہیں جن کے ذریعہ سے تم نے ایک عورت کو اپنے لیے جائز کیا ہے) اس سے مراد خود ایجاد کردہ نئی نئی شرطیں نہیں ہیں بلکہ وہی شرطیں ہیں جو رشتۂ ازدواج کے مقتضیات میں شامل ہیں اور جن کا ذکر خود قرآن و حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ آگیا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ جو شرطیں کتاب اللہ میں نہیں ہیں وہ سب باطل ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر ایسی شرط جو رشتۂ ازدواج کے مطالبات کے منافی ہو یا سرے سے اس اسکیم ہی کو تلپٹ کر دینے والی ہو جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے عائلی نظام کے لیے پسند فرمائی ہے وہ باطل ہے۔ اس بات میں تو ہمارے فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ صرف یہ شرطیں ہی باطل ہونگی، نکاح باقی رہے گا، یا ساتھ ہی نکاح بھی باطل ہو جائے گا، لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ اس طرح کی تمام شرطیں باطل ہیں۔ اگر کوئی خاص ضرورت داعی ہے تو مرد معاہدۂ نکاح میں یہ شرط تو کر سکتا ہے کہ وہ مہر فوراً ادا کر دے گا، یا ایک خاص مدت کے اندر اندر ادا کر دے گا، یا رہن کے طور پر وہ کوئی چیز بیوی کے قبضہ میں دے دیگا، یا کوئی دوسری ضمانت دیگا، یا اس کے نان نفقہ یا اس کی رہائش سے متعلق وہ کوئی انتظام اس کی خواہش کے مطابق کر دے گا۔ لیکن کوئی شرط میاں یا بیوی کی طرف سے معاہدۂ نکاح میں اس قسم کی شامل نہیں کی جا سکتی کہ مرد بیوی سے ملاقات نہیں کریگا، یا اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دیگا، یا پہلی بیوی کو نان نفقہ نہیں دیگا، یا اس کے لیے باری نہیں مقرر کریگا۔ اس طرح کی تمام شرطیں مقاصد نکاح کے بالکل منافی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس مرد معاہدۂ نکاح میں اپنے ان حقوق اور ان ذمہ داریوں سے بھی

استعفا نہیں دے سکتا جو اس پر بحیثیت قوام کے عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے گھر کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دے گا، بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شادی بیاہ کے معاملات سے بے تعلق رہے گا، نشوز پر بیوی کو کبھی تادیب نہیں کرے گا، بیوی کی آمد و رفت پر کوئی اعتراض نہ کرے گا، اخلاقی اور مذہبی کمزوریوں پر گرفت نہیں کرے گا، کبھی اس کو بستر میں تنہا نہیں چھوڑے گا، یا کسی حالت میں اس کو طلاق نہیں دے گا۔

یہ سارے حقوق و فرائض اللہ تعالیٰ نے درحقیقت مرد اور عورت دونوں کی فطرت کی بنیاد پر قائم کیے ہیں اور بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ[1] کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی فرما دیا ہے۔ اب اگر یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نہ عورت مرد کی فطرت اختیار کر سکتی ہے اور نہ مرد عورت کی فطرت اختیار کر سکتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ حقوق و فرائض بھی قابلِ انتقال نہ ہوں۔ اگر دھاندلی کر کے ان کو تلپٹ کرنے کی کوشش کی گئی، جن حقوق کو مرد ہی کے لیے استعمال کرنا موزوں تھا وہ عورت کے سپرد کر دیئے گئے، یا جن ذمہ داریوں کے لیے عورت ہی موزوں ہو سکتی تھی وہ اٹھا کر مرد پر ڈال دی گئیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ ہمارا سارا عائلی نظام درہم برہم ہو کے رہ جائے۔

ان دو اصولی باتوں کے بعد اب طلاق کی تفویض کے مسئلہ کو لیجیے اور اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیجیے۔

۱۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اس بات کو صحیح تسلیم کیے لیتا ہوں کہ ایک مرد اگر اپنی بیوی سے یہ کہہ بیٹھے کہ طلقی نفسک متی شئت (نیک بخت، جا تو جب چاہیو اپنے اوپر تین طلاقیں وارد کر لیجیو) تو عورت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ زندگی میں جب چاہے اپنے اوپر تین طلاقیں وارد کر کے میاں کے گھر سے رخصت ہو جائے۔ لیکن کیا کتاب و سنت کا وہ طریقہ پڑھنے والے ارکان کمیشن اور ایک مجلس کی تین طلاقوں کے نفاذ کو بدعتِ سیئہ قرار دینے والے یہ فقہائے گرامی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے طلاق کا مسنون طریقہ امت کو یہی سکھایا ہے؟ کیا قرآن و حدیث میں نکاح کا یہی طریقہ بتایا گیا ہے کہ

[1] بوجہ اس کے کہ اللہ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے

ہر مرد نکاح کے وقت ایک "معیاری نکاح نامہ" میں طلقی نفسک متی شئت" لکھکر اس پر اپنا انگوٹھا ثبت کر دیا کرے؟ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ بات اگر کہہ سکتا ہے تو ایک عورت بیزار شخص ہی کہہ سکتا ہے جس کو بیوی کے چھوڑنے یا رکھنے کی کوئی پروا نہ ہو، بلکہ وہ چاہتا ہو کہ جب بھی اس کا جی چاہے وہ دفع ہو جائے۔ اس کے اس قول پر اس پہلو سے تو غور ہو سکتا ہے کہ اس طرح عورت کو اپنے اوپر طلاق وارد کر لینے کا اختیار حاصل ہو گیا یا نہیں۔ لیکن یہ تو کسی عاقل آدمی کے ذہن میں خیال بھی نہیں گذر سکتا کہ اس طرح کے کسی بیزارانہ قول کو ایک اصولِ دین قرار دے کر اس کو ایک معیاری نکاح نامہ میں ثبت کر دیا جائے اور پھر پوری مسلمان قوم کے ہر نکاح کرنے والے مرد سے اس پر انگوٹھے لگوا لیے جائیں۔ کیا جو نکاح مودت اور سکینت کی سب سے بڑی بنیاد تسلیم کیا گیا ہے اور جس کے توڑنے کو اسلام نے انتہائی کراہت کے ساتھ گوارا کیا ہے اس کو ارکانِ کمیشن یہ شکل دینا چاہتے ہیں کہ اس کا آغاز ہی میاں اور بیوی کی طرف سے اظہارِ بیزاری سے ہو؟ اور جو طریقہ طلاق کے لیے بھی ایک نہایت غلط اور بھونڈا طریقہ ہے وہ نہ صرف طلاق کے لیے بلکہ نکاح کے لیے بھی ہمارے ملک میں اختیار کر لیا جائے؟ اور ہر نکاح کا آغاز ہی طلاق کے منحوس انتظام سے ہو؟

۲- دوسری بات یہ کہ اگر شرح وقایہ کے اس جزئیہ کو ایک اساسِ دین کا درجہ دے بھی دیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کس حیثیت سے اس اختیار کو استعمال کرے گی؟ اگر اس حیثیت سے استعمال کرے گی کہ مرد نے اپنا حق طلاق عورت کو تفویض کر دیا ہے تو پھر مرد کے پاس حق طلاق کہاں باقی رہا؟ اس نے تو اپنا حق عورت کے حوالہ کر دیا۔ اب اگر مرد طلاق دینے کی ضرورت محسوس کرے (اور بعض حالتیں ایسی بھی ہیں جن میں مرد پر بیوی کو طلاق دینا واجب ہو جاتا ہے) تو ایسی صورت میں یہ حضرت کیا کریں گے؟ کیا شادی بیاہ کی عدالت میں خلع کی درخواست لے کر جائیں گے کہ خدا کے لیے میری بیوی سے مجھے چھڑاؤ میں اس کے مہر سے باز آیا؟ یا اسی بیوی کے ساتھ مجبورانہ بندھے رہیں گے اگرچہ وہ کھلم کھلا دوسروں سے آشنائی شروع کر دے اور اگر میاں اس پر معترض ہوں تو تھوڑی سی ان کی مرمت بھی کر دیا کرے؟ اگر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ یہ حق طلاق شوہر کو بھی حاصل رہے گا تو میرے نزدیک یہ تفویض نہیں ہوئی بلکہ ایک مستقل تشریع ہوئی جس کا حق

اللہ اور رسول کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں۔ طلاق کا حق قرآن نے تو صرف مرد ہی کو دیا ہے اور یہ حق جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، عورت کی طرف منتقل کیے جانے کے لائق نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ جس طرح ایک شخص نکاح کے معاملہ میں کسی شخص کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے اسی طرح طلاق کے معاملہ میں بھی وہ کسی کو اپنا وکیل بنانے کا مجاز ہے اس وجہ سے اگر اس نے بیوی ہی کو اپنا وکیل بنا دیا تو یہ توکیل کی صورت ہو گی اور یہ جائز ہے۔ اس توکیل پر مجھے کئی اعتراض ہیں۔

اول تو یہ کہ احناف کے نزدیک کسی شخص کے لیے کسی کو وکیل بنانا صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ وہ بیماری یا غیر حاضری یا کسی دوسرے مانع کے سبب سے اپنے معاملہ کی ذمہ داریوں سے خود عہدہ برآ ہونے کے پوزیشن میں نہ ہو۔ اگر ایک شخص خود بر سر موقع موجود ہے، تندرست ہے اور اپنی ذمہ داری کو خود بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے تو اس کے کسی دوسرے کو وکیل بنانے کے کیا معنی؟ آخر اس نے کس وجہ سے عورت کو طلاق دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہے؟ کیا اس معاملہ کو سرانجام دینے کے لیے مرد بر سر موقع موجود نہیں ہے؟ یا اس کی زبان گنگ ہے؟ یا طلاق دینا کوئی ایسا مشکل فن ہے جس کے لیے مرد کے پاس کافی قابلیت نہیں ہے اور عورت اس میں مہارت رکھتی ہے؟

دوسرا یہ کہ نکاح کے معاملہ میں عورت کو وکیل بنانا مالکیہ اور شوافع کے نزدیک ناجائز ہے۔ اگر نکاح کے معاملہ میں ناجائز ہے تو میرے نزدیک طلاق کے معاملہ میں اس کی وکالت بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہونی چاہیے بالخصوص جبکہ وہ طلاق اسے اپنے ہی اوپر وارد کرنی ہے۔ اس شخص سے بڑھ کر کون احمق ہو سکتا ہے جو اپنے مدعا علیہ ہی کو اپنے مقدمہ میں اپنا وکیل بنائے۔

تیسرا یہ کہ عورت کو اپنا وکیل بنا دینے کے بعد مرد حق طلاق کو اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتا جب تک وہ وکیل کو معزول نہ کر دے یا وکیل اس کو اس کا حق واپس نہ کر دے۔ جو صورت کمیشن نے تجویز کی ہے اس میں وکیل کی معزولی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر عورت یہ حق مرد کو واپس کر دے تو پھر اس کے پاس حق طلاق باقی نہیں رہتا۔ اور اگر نہ واپس کرے تو مرد اس حق سے محروم ہو جاتا ہے پھر طلاق کے معاملہ میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات کہاں ہوئی؟

تیسری بات یہ کہ معاہدۂ نکاح میں یہ شرط کس نوعیت سے داخل کی جائے گی؟ کیا ہر مرد کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو حق طلاق تفویض کرے؟ یا یہ شرط اختیاری ہوگی کہ جس کا جی چاہے تفویض کرے اور جس کا جی نہ چاہے وہ تفویض نہ کرے؟ اگر دوسری صورت ہے تو ہمارے معاشرے میں ایسے احمق مروبیت کم نکلیں گے جو خود اپنے پاؤں میں یہ کلہاڑی خود اپنے ہی ہاتھوں مارنے پر راضی ہونگے؛ اور اگر یہ شرط جبری ہوگی، ہر مرد کے لیے ضروری ہوگا کہ یہ شرط معاہدۂ نکاح میں تسلیم کرے، تو یہ طلاق تفویض نہیں ہوئی بلکہ یہ طلاق مکرہ ہوگئی کیونکہ مرد کو اس بات پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ طلاق کا اختیار جو از روئے شرع صرف اسی کو حاصل ہے اپنی بیوی کے حوالہ کر دے۔

یہ طلاق مکرہ وہی شئے ہے جس کے خلاف حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جابر عباسی خلیفہ کے مقابل میں صدائے احتجاج بلند کی اور اس جرم میں ان کی مشکیں کس کے تشہیر و تذلیل کے ارادہ سے ان کو اونٹ پر سوار کرایا گیا۔ لیکن یہ امام جلیل بجائے اس کے کہ اس ابتلا سے پست ہمت اور مرعوب ہوتے اعلانِ حق کے لیے اونٹ پر تن کر کھڑے ہوگئے اور تاریخ میں یاد رہ جانے والا یہ فقرہ فرمایا کہ "جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہے، جو نہ پہچانتا ہو وہ اب پہچان لے میں مالک بن انس ہوں اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ طلاق مکرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے" اس کے بعد ان کی مشکیں اس زور سے ساتھ کسی گئیں کہ ان کے بازو چٹر چٹرا اٹھے۔

ممکن ہے کسی صاحب کو یہ خیال ہو کہ آخر طلاق مکرہ بھی تو بعض فقہا کے نزدیک جائز ہے پھر کیا مضائقہ ہے اگر ہم اپنے عائلی نظام کی بنیاد اسی پر قائم کریں۔ ان کے اطمینان کے لیے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو اس کو جائز سمجھتے ہیں وہ بھی ہر شکل میں اس کو جائز نہیں سمجھتے بلکہ صرف اس صورت میں جائز سمجھتے ہیں جب قانون اور عدالت سے اس اکراہ کا مداوا ممکن نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ کوئی مستبد حکمران کسی کو مجبور کرکے اس کی بیوی کو طلاق دلوا دے۔ ایسی صورت میں اس کو جائز قرار دینے والوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر اس کو جائز نہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس عورت کا کسی بھی دوسرے شخص سے نکاح زنا کے حکم میں ہے اور اس سے جو اولادیں پیدا ہوں وہ سب حرامی ٹھہریں۔ عورت کو اس مفسدہ سے

بچانے کے لیے بعضوں نے اس کو جائز قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جو مرد یا عورت مکروہ کے حکم میں ہے اس کے اوپر جہاں تک آخرت کا تعلق ہے وہاں تو کوئی مواخذہ ہے نہیں۔ رہے دنیا کے معاملات تو ان میں اگر اس کے سبب سے کوئی مفسدہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوا کرے۔ چند افراد کو ایک فرضی مفسدہ سے بچانے کے لیے حرام کو حلال نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اگر یہ غلطی کی گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ چند افراد کو مفسدہ سے بچانے کے لیے پوری قوم کے لیے مفسدہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔

تاہم اگر طلاق مکروہ کسی مذہب فقہی میں مطلقاً بھی جائز ہو تو اس کا جائز ہونا اور چیز ہے اور اسے ایک مطلوب شے قرار دے کر دنیا کے ہر مرد پر از روئے ضابطہ اسے مسلط کر دینا اور شے۔ کیا کسی مذہب فقہی میں یہ بھی جائز ہے؟

۴۔ اگر طلاق تفویض کا یہ طریقہ چل پڑے تو ہماری گھریلو زندگی کا جو نقشہ بنے گا آج اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ مرد اگر طلاق دیتا ہے تو اس کو اس معاملہ کے ہزار پہلو سوچنے پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کے سامنے اپنی عزت و شہرت (جیسی کچھ بھی وہ ہے) کا سوال آتا ہے، اگر بچے ہیں تو بچوں کی پرورش و تربیت کا مسئلہ آتا ہے اور یہ مسائل اس کے لیے اتنے اہم ہوتے ہیں کہ جب تک وہ انتہائی حد تک مجبور نہ ہو جائے بیوی کو طلاق دینے کی جرأت نہیں کرتا۔ لیکن اگر یہ حق اس نے بیگم صاحبہ کی طرف منتقل کر رکھا ہے تو کوئی ذرا سی بات بھی بیگم صاحبہ کو اس قدر برہم کر دے سکتی ہے کہ وہ اپنے اوپر تین طلاقیں وارد کر کے چل کھڑی ہوں۔ کیونکہ نہ تو ان کو مہر ادا کرنا ہے، نہ زمانہ عدت کا خرچ برداشت کرنا ہے نہ چھوٹے بچوں کے زمانہ حضانت و رضاعت کی کفالت کا کوئی بار ان کے اوپر ہے۔ وہ تو کچھ کھوئیں گی نہیں بلکہ طلاق کے نتیجہ میں کچھ نہ کچھ مرد سے وصول ہی کریں گی۔ مرد غریب پھر تو کمیشن نے یہ پابندی بھی عائد کرنی چاہی ہے کہ وہ اگر طلاق دے تو کسی عدالت میں حاضر ہو کر اس کا کوئی معقول سبب بتائے اور اگر کوئی معقول سبب نہ بتا سکے تو عورت کے نکاح ثانی یا اس کے حین حیات تک کے لیے اس کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ عورت پر کمیشن نے اس قسم کی بھی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے اور ڈالے بھی کیوں؟ مردوں کو تو عدالت سے فیصلہ حاصل کرنے کا پابند اس وجہ سے کیا جا رہا ہے کہ طلاق کے معاملہ